تین واضح چیلنج دیے ہیں :

(۱) پہلا چیلنج اس صدی کے آغاز غالباً ۱۹۱۰ء میں انگلستان کے شہرۂ آفاق فلسفی بریڈلے (F.H. BRADLAY) نے دنیا کے تمام حامیانِ مذہب کو دیا تھا۔

تم تو بریڈلے سے ضرور واقف ہو گے لیکن عام قارئین کی اطلاع کے لیے اس قدر صراحت ضروری ہے کہ میری رائے میں ہیگل کے بعد دنیا میں تصوریت مطلقہ ——— (ABSOLUTE IDEALISM) کا اس سے بڑا علمبردار اور کوئی نہیں گزرا اور اس کا شاہکار "مظاہر اور حقیقت" (APPEARNACE & REALITY) کانٹ کے شاہکار "تنقید عقل خالص" (CRITIQUE OF PURE REASON) کے بعد، فلسفے کی دنیا میں سب سے بڑی تصنیف ہے۔ اور یہ رائے صرف میری نہیں ہے، بلکہ انگلستان کے مشہور فلسفی EDWARD CAIRD اور مشہور عالم الہیات ریشڈل (RASHDALL) کی رائے بھی یہی ہے۔ نیز ہندوستان کے مشہور فلسفی پی۔ ٹی۔ راجو (P.T. RAJU) کی رائے میں تو بریڈلے کا شمار دنیا کے عظیم حکماء میں سے ہے۔

بریڈلے نے تو اپنی تصنیف مذکورہ کے پہلے حصّہ میں مسلک مادّیت کی تردید میں ایسی براہین قاطع اور ادلّۂ ساطع جمع کر دی ہیں جن کا جواب آج تک کسی مادہ پرست سے ممکن نہیں ہو سکا، اور نہ آئندہ ہو سکے گا۔ قدماء میں یونان میں زینو (   ) اور ہندوستان میں ناگارجن (بودھ دھرم) کے فلسفیانہ مدرسۂ فکر المسمّٰی بہ شونیلےواد کا عظیم ترین علمبردار منطقی موشگافیوں میں بریڈلے کے ہم پلّہ ہیں۔ بریڈلے کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ عصرِ حاضر کا نامور فلسفی برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ – ۱۹۷۲) جو تصوریت مطلقہ (ABSOLUTE IDEALISM) کا سخت مخالف ہے، بریڈلے کی عظمت و رفعتِ فکر کا ساری عمر معترف رہا۔ دیکھو، 'SCEPTICAL ESSAYS' P.39

آمدم بر سرِ مطلب، بریڈلے نے اپنے مجموعہ مقالات موسومہ بہ — 'ESSAYS ON TRUTH & REALITY' کے ایک مقالے کے آخر میں (جس کا نام ہے 'ON GOD AND THE ABSOLUTE' ہے

یہ قابلِ غور پیراگراف لکھا ہے :

"میرے خیال میں دنیا کو اس وقت ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے جس کے لیے کچھ تقاضے بھی ہونے لگے ہیں۔ ہمیں ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے، جو تمام انسانی اغراض اور مطالبات کو ایک خاص تناسب کے ساتھ ملحوظ رکھے اور ان کے جواز کا اعتراف کرے اور عقلِ انسانی کے لیے ایک ایسی بنیاد فراہم کرے جس پر پورے اعتماد سے بھروسہ کیا جاسکے۔ کیا ہم یہ نیا مذہب حاصل کرلیں گے؟ کیا یہ نیا مذہب موجودہ مذاہب میں ترمیم و تنسیخ کے ذریعے بنے گا یا کسی اور طریقے سے، میں اس کا فی الحال کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ لیکن جہاں تک میری بصیرت کام کرتی ہے، دنیا کے اس عام تقاضے کو پورا کرنا فلسفے کے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے اس امر میں بھی شک ہے کہ کسی مذہب کے اصول بالآخر ہماری "ULTIMATE CONSISTENCY" کی مابعد الطبیعاتی ضرورت کو پورا کرسکیں گے۔ میری رائے میں جس چیز کی ہم معقول طور پر خواہش کرسکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ایک عقیدہ ہو اور دوسری طرف ایک تحقیقی فلسفہ، جو اس عقیدے کے لیے جواز اور استدلال مہیا کرے۔ میرا خیال ہے کہ کسی مثبت مابعد الطبیعاتی نظریے کی بنیاد باطنی تجربے پر ہونی چاہیے، جبکہ مذہب کی بنیاد اگر باطنی تجربے پر ہو تو وہ زندگی سے فرار اور محرومی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے ایک مذہبی عقیدہ جس کی بنیاد مابعد الطبیعیات کے سوا کسی اور چیز پر ہو یا ایسا مابعد الطبیعاتی فلسفہ جو کسی مذہبی عقیدے کی تائید کرسکے، ہماری خواہشات کو پورا کرسکتا ہے۔ ممکن ہے میں خود اس خواہش کو پورا ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکوں اور اگرچہ اس راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں لیکن پھر بھی میں اس کی تکمیل کو ممکن نہیں سمجھتا۔"

(اس کا اصل انگریزی پیراگراف ٹائمیل کے اندر کے صفحہ پر دیکھیں)

تمہاری آگاہی اور معلومات میں اضافے کی خاطر یہ بات ذیل میں درج کرنی چاہتا ہوں کہ اس پیراگراف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ پروفیسر

جیمس وارڈ نے اپنے آخری مقالے میں، جو انہوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے لکھا تھا، مرتومہ بالا پیراگراف کو من وعن نقل کیا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے "ایمان اور حیاتِ ابدی"

خلط مبحث کے خوف سے میں اس مقالے کا تعارف پیش نہیں کروں گا لیکن وارڈ سے متعلق چند تعارفی الفاظ ضرور لکھنا چاہتا ہوں۔

یہ مذہبی فلسفی جو دراصل ایک عالم الٰہیات تھا، بریڈلے کا ہمعصر تھا۔ اُس نے بریڈلے سے ایک سال کے بعد ۱۹۲۵ء میں وفات پائی، اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں

1. NATURALISM AND AGNOSTICISM. 1899

2. THE REALM OF ENDS: PLURALISM & THEISM. 1911

بریڈلے تصوریت مطلقہ کا علمبردار تھا اور جیمس وارڈ تصوریت کا مخالف اور حامیٔ مذہب عیسوی عالم تھا۔ لیکن اس نے بریڈلے کے اس چیلنج کو اس قدر وقیع اور لائقِ توجہ سمجھا کہ اپنے مقالے میں اس کو لفظ بہ لفظ نقل کیا اور اس سے ایمان کی اہمیت پر استشہاد کرنے کے بعد یہ تمنا ظاہر کی کہ "میں تو اب لبِ گور ہوں، کاش کیمبرج کا کوئی عالم الٰہیات، آکسفورڈ کے اس شہرۂ آفاق فلسفی کے چیلنج کا جواب باصواب لکھے۔"

وارڈ نے یہ مضمون ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا مگر ابھی تک کسی نصرانی عالم نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی تثلیث، تجسّم اور کفارہ کا معتقد بریڈلے کے چیلنج کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

(۲)

۱۹۳۸ء میں لارڈ لوتھین نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو خطبۂ تقسیم اسناد (CONVOCATION ADDRESS) دیا، اس میں اس نے بایں الفاظ مسلمانوں کو چیلنج دیا:-

"میرے عزیز مسلمان نوجوانو!

اس وقت یورپ روحانی اعتبار سے مُردہ[1] ہے۔ اور اخلاقی لحاظ سے

---

[1] مُردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام (اقبال)

مریض[1] ہے اور معاشی زاویہ نگاہ سے سخت مضطرب[2] ہے اور تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں[3] مار رہا ہے۔

وہ اپنی اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کو تسلی بخش طریقے سے حل نہیں کر سکتا۔ وہ اس وقت ایسے نظامِ حیات کی تلاش میں ہے جو اس کے روحانی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، اور عمرانی مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکے۔

اے نوجوانو! تمہارا دعوےٰ ہے کہ اسلام بنی آدم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس میں عقل، دل اور نگاہ تینوں کی تشفی بلکہ آبیاری کا سامان موجود ہے۔

لہٰذا میں تمہیں مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم تازہ گریجویٹوں میں سے جو لوگ اپنے دین کی صداقت پر پختہ یقین رکھتے ہیں، وہ اپنے دین کی تبلیغ کے لیے یورپ کے مختلف ملکوں میں مبلغ اسلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں اور اپنی زندگی اس مقدس کام کے لیے وقف کر دیں۔"

میرے بیٹے میں نے یہ چیلنج ۱۹۳۸ء میں پڑھا تھا۔ وہ رسالہ تو ضائع ہو گیا مگر چیلنج کا مفہوم اسی وقت میرے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ لارڈ موصوف کا یہ خطبہ ہندوستان کے کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوا تھا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔

(۳)

تیسرا چیلنج پروفیسر ولیم منٹگمری واٹ نے ۱۹۵۶ء میں دیا۔ یہ فاضل شخص ایڈنبرا یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر ہے۔ اور اس نے بڑی جانفشانی اور تحقیق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، شخصیت، کارہائے نمایاں اور آپ کے پیدا کردہ انقلاب پر دو کتابیں لکھیں۔

1. 'MOHAMMAD AT MECCA'
2. 'MOHAMMAD AT MADINA'

---

[1] یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد ! زیر گردوں رسم لادینی نہاد ! (اقبال)

[2] اک اضطراب ہے دنیا کو ناصبوری سے سبب یہ ہے کہ وہ محروم ہے حضوری سے ! (اکبر)

[3] تدرجِ خود فروزے کہ فرنگ داد مارا ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد (اقبال)

یہ دونوں کتابیں ایک خاص نہج پر لکھی ہیں اور جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے، انگریزی یا کسی اور زبان مثلاً اردو، فارسی اور عربی میں کسی شخص نے یہ اندازِ سیرت نگاری اختیار نہیں کیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ دونوں کتابوں کے چھ سو صفحات پڑھ لینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت کا کوئی نقش قاری کے ذہن پر قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے مستشرقین کی تصانیف کا طغرائے امتیاز۔

بہرحال اپنی دوسری تصنیف میں ص ۳۴۳ پر واٹ نے حسبِ ذیل الفاظ میں ساری دنیائے اسلام کو چیلنج دیا ہے:

" اب مسلمان اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ محمدؐ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے کردار اور اخلاق کا ایک مثالی نمونہ ہیں۔ یہ دعوے کر کے وہ دنیا کو اس امر کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ حضورؐ کے اخلاق کا جائزہ لیں... کیا محمدؐ کی زندگی اور تعلیمات سے ایسے اصول سیکھے جا سکتے ہیں جو مستقبل کی دنیا کے لیے ایک واحد ضابطۂ اخلاق کی بنیاد بن سکیں؟

دنیا نے ابھی اس سوال کا حتمی جواب فراہم نہیں کیا۔ مسلمانوں نے محمدؐ کے متعلق اپنے دعوے کی تائید میں جو کچھ کہا ہے، وہ اس دعوے کے ابتدائی بیانات سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ کچھ عیسائی اس سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ دنیا محمدؐ کے متعلق، اس دعوے کا کیا جواب دیتی ہے، اس کا انحصار کسی حد تک اس بات پر بھی ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کا اپنا عمل کیا ہے۔ یہ بات ابھی مسلمانوں کے ذمے ہے کہ وہ باقی دنیا کے سامنے اپنے دعوے کا بھرپور اور بہتر ثبوت پیش کریں۔ کیا مسلمان محمدؐ کی زندگی کی طرف پھر رجوع کر سکیں گے اور اس میں سے عالمگیر اصولوں کو ہنگامی خصوصیات سے الگ کر کے ایسے اخلاقی اصولوں کا انکشاف کر سکیں گے جو دنیا کی موجودہ حالت کو بہتر بنانے کے لیے ان کی جانب سے ایک تعمیری کوشش ثابت ہو۔ یا اگر یہ امر، توقع سے کچھ زیادہ ہے تو کیا مسلمان، کم از کم، یہ ثابت کرنے کے قابل ہو سکیں گے کہ محمدؐ کی زندگی متحدہ عالم کے اخلاق کے لیے مثالی انسان کی ایک قابلِ عمل مثال ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے کے قابل ہو سکیں تو کچھ عیسائی یقیناً ان کی بات سننے کو تیار ہو جائیں گے۔

میں اپنی ذاتی رائے کو چھپانا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں مسلمان دنیا کی رائے کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے، کم از کم اخلاق کے میدان میں۔ عیسائی یورپ کو اس امر کا قائل کرنے کے لیے کہ محمدؐ کی تقلید سے اخلاق کے مثالی نمونے پیدا ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کو تاحال بہت کم، بلکہ کوئی کامیابی حاصل ہی نہیں ہوئی۔

(MOHAMMAD AT MEDINA, PAGE 333-334, 1962)

میرے بیٹے! یہ ہیں وہ تین زبردست چیلنج جو عیسائی دنیا نے مسلمانانِ عالم کو اس صدی میں دیے ہیں۔ ہماری قوم کے علمائے کرام اور صوفیانِ عظام چونکہ بالعموم انگریزی زبان سے ناآشنا ہیں اس لیے نہ وہ ان چیلنجوں کو پڑھتے ہیں اور نہ ان اعتراضات سے آگاہ ہو سکتے ہیں جو یورپ کا مذہبی طبقہ قرآن اور حاملِ قرآن پر دو سو سال سے کرتا چلا آرہا ہے۔ سچ کہا تھا کسی نے کہ "لاعلمی بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔" اسی لیے ہمارے علماء اور صوفیاء کی راتیں کسی قسم کی کشمکش میں نہیں گزرتیں اور اسی لیے تو وہ بڑے اطمینان سے تعیین تعدادِ رکعاتِ تراویح، قرأتِ فاتحہ خلف الامام، تقبیل الابہامین، رفعِ سبابہ، آمین بالجہر، رفع یدین اور الزاق الکعبین بلکہ امکانِ کذبِ باری اور امتناعِ نظیرِ پیغمبر جیسے مفید اور ایمان افروز مسائل میں منہمک رہتے ہیں۔[1]

رہے ہماری قوم کے انگریزی دان حضرات، تو وہ ان چیلنجوں سے تو آگاہی حاصل کر لیتے ہیں مگر چونکہ قرآن اور اس کی زبان دونوں سے نابلد ہیں (الا ماشاءاللہ) اس لیے کسی چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے۔ صرف چند لمحات کے لیے متاسف ہو کر "پھر کارِ دیگر" میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ خلاصۂ کلام اینکہ عربی دان اور انگریزی دان دونوں میں سے کوئی طبقہ کسی چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔[1]

۱- اندریں حالات میں تمہیں ان تینوں چیلنجوں کو قبول کرنے کا مشورہ دیتا ہوں اور اسی غرض سے یہ خامہ فرسائی کی ہے۔ تم نے بفضلِ خدا انگلستان سے فلسفے میں

---

[1] واضح ہو کہ میں نے مثالاً یہ چند مسائل لاطائل درج کر دیے ہیں۔ اگر استقصار کیا جائے تو کئی صفحات سیاہ ہو سکتے ہیں۔

ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے اور فلسفۂ جدیدہ میں ڈاکٹریٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

۲۔ تم ایک دیندار اور علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔

۳۔ تم نے دینی ماحول میں پرورش پائی ہے۔

۴۔ تمہارے اندر دین کی تبلیغ کا جذبہ بھی موجود ہے اور

۵۔ تم دینِ اسلام کو علیٰ وجہ البصیرت بنی آدم کے لیے بہترین ضابطۂ حیات یقین کرتے ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہارے بڑے بھائی اخویم اسرار احمد سلّمہٗ نے اپنی زندگی اشاعتِ قرآن کے لیے وقف کر کے تمہارے لیے ایک اعتبار سے اسوۂ حسنہ بھی پیش کر دیا ہے۔

لہٰذا اب جس طرح تمہارے بڑے بھائی نے اپنی زندگی دعوت الی القرآن کے لیے وقف کر دی ہے تم اپنی زندگی مغرب کو اسلام کی خوبیوں سے روشناس کرانے کے لیے وقف کر دو تو تمہیں وہ کامیابی حاصل ہو گی جو تمہارے پیش رو حضرات کو حاصل نہ ہو سکی۔ میں ان سب لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے بیسویں صدی میں اپنی زندگی تبلیغ کے لیے وقف کی۔ مگر ان میں سے کوئی شخص منطقی اور فلسفی نہیں تھا، اور اس لیے وہ اسلام کو دیہات میں تو پیش کر سکے، آکسفورڈ یا کیمبرج میں پیش نہ کر سکے۔

دیکھ لو! ٹیگور اور رادھا کرشنن نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں ہندو دھرم کو پیش کر کے غیروں کی نگاہ میں کتنی شہرت اور اپنوں کی نظر میں کتنی عزت حاصل کی ہے۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے۔ اگر مل سکے تو رادھا کرشنن کی 'AN IDEALIST VIEW OF LIFE' ضرور پڑھ لینا۔ یہ 'HIBBERT LECTURES' ہیں اور ان میں اس نے ہندوؤں کے فلسفیانہ مذہب یعنی 'VEDANTIC IDEALISM' کی برتری تمام مدارسِ فلسفہ پر ثابت کر کے اپنی علمیت اور ویدانت کی عظمت کا سکّہ انگریزوں کے دل و دماغ پر جما دیا ہے۔ پروفیسر میکنزی، پروفیسر میور ہیڈ اور پروفیسر جوڈ کا اعتراف تو میں خود پڑھ چکا ہوں۔ ؎

(بقیہ صہ ۵۹ پر)

کتابیات ۱

سیرۃ الخلیل (باب دوم)

بیان و برہان کی خوش اسلوبی اور شہ زوری

مولانا الطاف الرحمٰن منوی

جس طرح انسانوں کی رنگتیں اور حلئے ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہوتی ہیں اور باوجود اوّلین و آخرین کی اس کثرت کے دو انسانوں کے رنگ و حلئے کی مکمل وحدت کی کوئی ایک مثال بھی دیکھی اور نہ سنی گئی ہے اسی طرح سے ان کی طبیعتیں اور ذہنیتیں بھی یکساں نہیں ہوتیں بلکہ فعل و انفعال اور تاثیر و تأثر میں متفاوت ہوتی ہیں۔ افتادِ سرشت کا یہ فرق ان کی زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور یہی وہ فطرۃ اللہ ہے جس کا ہر فرد بشر بلا کم و کاست غیر شعوری طور پر پابند ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر عقل و فلسفے کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ہر بات کو اسی کی روشنی میں دیکھتے اور اسی کی میزان سے تولتے ہیں جب تک کسی مدّعا کو عقلی دلائل کے حاصل اور نتیجے کے طور پر پیش نہ کیا جائے کوئی اعجوبہ اور کرشمہ ان کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو استدلال کی پیچیدگیوں سے گھبراتے ہیں فکر و نظر کی بھول بھلیوں سے اکتاتے ہیں درایت نام کی کوئی چیز پہچانتے ہیں اور نہ ہی درایتی نقد و جرح کا عمل جانتے ہیں ان کے ہاں رد و قبول کا معیار نرا وجدان ہوتا ہے جو کبھی تو بڑی آسانی سے کسی سیدھی سادھی اور بالکل ہی مبتذل قسم کی بات سے یکایک متاثر ہو جاتا ہے اور کبھی بمشکل ہی کسی غیر معمولی اور خرقِ عادت ادا سے۔

خدائے قدوس کی رحیمی و کریمی اور شفقت و مہربانی انسانوں کی ہدایت کے لئے انہی کی جبلّت اور صلاحیت کے مطابق انتظام کرتی ہے۔ تاکہ اگر کسی کے اندر توجہ و انابت کی ادنیٰ ترین رمق بھی موجود ہو تو صواب و ثواب سے محروم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبیؑ کو بالخصوص اس نوع کے دلائل و معجزات دیئے جاتے ہیں جو اہل زمانہ کی ذہنی سطح اور استعداد سے قریبی رشتہ رکھتے ہوں نیز اظہارِ کمال کے لئے وہی میدان منتخب کیا جاتا ہے جس سے ابنائے قوم کے

زیادہ سے زیادہ دلچسپیاں وابستہ ہوں

تواریخ و آثار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی کے ساتھ ساتھ ستارہ پرست بھی تھی۔ چنانچہ اسی تعلق سے نجوم و ہیئت میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ علامہ عباس محمود عقاد مصری " ابوالانبیاء" میں لکھتے ہیں۔

"تاریخی کھوج لگانے والوں نے بابل اور اشور کے آثارِ عتیقہ میں لوہے کی تختیوں پر ایسے بہت سے کلمات پائے ہیں جو قدیم علم الافلاک کی اصطلاحیں ہیں ان میں منازل و بروج کے اسماء بھی شامل ہیں اور کواکب و نجوم کے مجموعے بھی۔"

سائنسی آلات اور دوربینیں تو اس وقت تھیں نہیں جن کی مدد سے افلاک و کواکب کے محل وقوع اور حرکات و کیفیات کا عینی مشاہدہ کرتے۔ لہٰذا لازمی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ ان کے علم و فن کا تمام تر دارومدار انیّات ـــــ وجود معلول سے وجود علت معلوم کرانے کے طریقۂ استدلال ـــــ پر تھا، اس قسم کے نجوم و ہیئت میں تحقیق و تفحص کی جن باریکیوں اور موشگافیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور پھر ان بحثوں کے تداول اور جولانیوں سے انسانی ذہن کا جو سانچہ تیار ہوتا ہے۔ اور اثر اندازی و اثر پذیری کی جس ڈگر کا خوگر بنتا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی بڑی مناظرہ باز اور محبت طراز واقع ہوئی ہوگی اور محاجاۃ ہی کو وہ بنیادی اور آخری معرکہ سمجھتی ہوگی جس کا سر کرنا ہی کسی اہم مقصد کی طرف رسائی کا مؤثر ذریعہ بنتا ہو۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ ذکر میں اس کے مناظرات کو بڑی تفصیل اور اہتمام سے ذکر کیا ہے۔

لیکن اس تجزئے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر قوم میں عوام کی تعداد خواص سے زیادہ ہوتی ہے جہاں نمرودی حکومت کے ارکین و اساطین اور بابل کی مذہبی نمائندگی کرنے والے پیشواؤں اور مقتداؤں کو فکر و دانش کی قوتوں سے رام کیا جا سکتا تھا۔ وہاں عوامی اکثریت کے اطمینان و تسلی کے لئے بھی پیغمبر کی ذات میں مناسب مواد ہونا ضروری تھا۔[1]

---

[1] مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اپنی کتاب "منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" میں انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے طریقۂ تعلیم پر بحث کرتے ہوئے قرآنی دلائل کی نوعیت کے (باقی اگلے صفحہ پر)